عرصے سے حکمائے اسلام نے عقل اور وحی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ رکھا ہے۔ مسلم متکلمین مشاہدے کے مقابلے میں وجدانی علوم کے تفوق کے قائل رہے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں مشاہداتی علوم کے سلسلے میں ایک طرح کی بے توقیری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید، جو مسلمانوں میں وجدانی علوم کا بنیادی ماخذ ہے، تدبر و تفکر اور مشاہدے کی بھرپور وکالت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وجدان کی عمارت تعقل کی بنیادوں پر رکھی جائے۔ بھلا جو وجدان عقل کو قائل نہ کر سکے یا جو دانش انسانی کی پہنچ سے باہر ہو اسے انسانوں کے لئے مشعل راہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

امت مسلمہ کی تشکیل نو

اسلام پوری انسانیت کے لئے خدا کا پسندیدہ دین ہے اور محمد رسول اللہ کافۃ للناس بشیرا و نذیرا اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ اسلام کی یہ دعوت جسے آخری نبی اور ان کے سچے متبعین کے ہاتھوں تاریخ کے آخری لمحے تک انسانیت کی رہنمائی کرنی ہے کسی قومی یا ملی شناخت کا نام نہیں بلکہ غیر مشروط سپردگی کے اس والہانہ رویے کا نام ہے جس کا اظہار انسانی تاریخ میں تسلسل اور ترتیب کے ساتھ انبیائے کرام کے ذریعے ہوتا رہا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں تاریخ کے مختلف ادوار میں، تمام ہی انبیاء انسانوں کو غیر مشروط عبودیت کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ اب جب سلسلۂ رسالت اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے، سپردگی کی اس تحریک کو اپنے انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری محمد رسول اللہ کے متبعین پر عائد کی گئی ہے۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ انبیائے سابقین کی دوسری امتیں یا متقین کے دوسرے گروہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس عظیم نبوی تحریک سے باہر کر دیئے گئے ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے جہاں متبعین محمد کو کلیدی اور مرکزی کردار ادا کرنا ہے وہیں دوسری اقوام کے متبعین کو بھی اس انبیائی تحریک میں اپنی بساط بھر شریک ہونا ہے کہ انسانیت کی فلاح کا کوئی وسیع پروجیکٹ وسعتِ نظری اور وسعت قلبی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اگر اسلام کی دعوت سے مراد کسی خاص لسانی، قومی، جغرافیائی یا ملی گروہ کا غلبہ نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت کی سعید روحیں خواہ وہ دنیا کی کسی قوم یا ملت میں پائی جاتی ہوں اس تحریک میں اپنے اندر والہانہ شرکت کا داعیہ محسوس نہ کریں۔

قرآن کا ایک معمولی طالب علم بھی اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ ابراہیمؑ سے لے کر محمدؐ تک اس دنیا میں انبیاء کے ذریعے انسانوں کو جس بات کی طرف بلایا جاتا رہا ہے وہ خدا کے آگے غیر مشروط سپردگی کی یہی دعوت ہے جسے ہم اسلام سے موسوم کرتے ہیں۔ ابراہیم، اسحٰق و اسمٰعیل بنی اسرائیل کے تمام انبیاء اور دیگر اقوام کی طرف بھیجے جانے والے نبی حتّٰی کہ وہ بھی جن کا تذکرہ قرآن میں موجود نہیں ہے، ایک ہی دین کے امین اور مبلغ رہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کے حوالے سے مسلم ذہنوں میں کسی قسم کے گروہی تعصب کا داعیہ پیدا ہو۔ قرآن مجید کی یہ تنبیہ کہ اہلِ ایمان انبیاء کے سلسلے میں ﴿لا نفرق بین احد من

رسلہ﴾ (البقرۃ:۲۸۵) کے رویے پر عامل ہوتے ہیں، دراصل اسی بات کو ذہن نشین کرانا ہے کہ خانوادۂ نبوت کے تمام ہی عالی مقام حاملین ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک کی شخصیت یا دعوت دوسرے سے متصادم یا متعارض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ کے متبعین کے لئے اس بات کو لازم کیا گیا کہ وہ نہ صرف اس کتاب پر ایمان لائیں جو محمدؐ کی طرف بھیجی گئی ہے بلکہ ان تمام سابقہ کتب اور انبیاء کو بھی اسی نبوی تحریک کا حصہ سمجھیں جن کے باقیات دنیا کے مختلف خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ گویا آخری رسولؐ کی بعثت سے کسی نئے دین کی داغ بیل نہیں ڈالی جارہی ہے اور نہ ہی قرآنی وحی کسی نئی ابتداء کا سامان ہے بلکہ یہ پچھلوں کی تصدیق کرنے اور باقیات امم سابقہ کے ورثے کو سمیٹتے ہوئے، بنیادی باتوں پر ان کو اشتراکِ عمل کے ذریعے ایک ایسے عالمی انقلاب کی بنیاد رکھنے جارہی ہے، جس میں تمام ہی انبیائے سابقین کی دعوتوں کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔

محمد رسول اللہ نے کسی نئی امت کی بنیاد نہیں رکھی اور نہ ہی اپنے متبعین کو کسی نئے گروہ سے موسوم کیا۔ قرآن کا انداز دعوت اس نکتہ کی مسلسل وضاحت سے عبارت ہے کہ محمد رسول اللہ کسی نئی امت کے قیام کے بجائے اطاعت گزاروں کے اسی خانوادے کے احیاء کیلئے تشریف لائے ہیں جن کی باقیات مختلف شکلوں میں اس سرزمین پر موجود ہے اور جن کا نظری وفکری ماحصل اب صرف یہی رہ گیا ہے کہ وہ انبیائے سابقین سے اپنا نسلی یا مذہبی رشتہ بتاتے رہیں اور اسے اپنی نجات کے لئے کافی سمجھیں۔

﴿وقالوا کونوا هودًا أو نصارىٰ﴾ کے جواب میں یہ کہا جانا کہ ﴿قل بل ملة ابراهيم حنيفا﴾ (البقرۃ:۱۳۵) دراصل اسی وسعت فکری کا اظہار تھا کہ آخری نبی کسی نئی امت کے قیام کا داعی نہیں بلکہ امت ابراہیمی کا احیاء کرنے والا ہے اور اسکی دعوت تمام انبیائے سابقہ کی دعوتوں کا ارتکاز ہے: ﴿قل اننی هدانی ربی الی صراط مستقیم دینا قیماً ملة ابراهیم حنیفا﴾ (الأنعام:۱۶۱)۔ قرآن مختلف اسالیب میں بار بار اس حقیقت کو ذہن نشین کراتا ہے کہ متبعین محمد کو جو کچھ عطا ہوا ہے یہ وہی دین ہے جو اس سے قبل انبیائے سابقین لاتے رہے ہیں: ﴿شرع لكم من الدين ما وصىٰ به نوحاً والذی اوحينا اليك﴾ (الشوریٰ:۱۳)۔ دین ابراہیمی کے سابق دعویدار انبیائے سابقین کے متبعین سے باسالیب مختلف یہ بات کہی جاتی رہی کہ فی زمانہ دین ابراہیمی کا امین محمدؐ کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے: ﴿ ان أَولى الناس با براهيم للذين اتبعوه وهذاالنبیّ والذين آمنوا ﴾ (آل عمران:۶۸)۔ رہے وہ لوگ جو محمدؐ پر ایمان لے آئے ہیں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ نئے نبی کی قیادت میں اسی دین پر کاربند ہیں جس کے بابت انہیں اس سے پہلے توراۃ وانجیل میں انہیں بتایا جاچکا ہے۔ ﴿الذين يتبعون الرسول النبی الامی الذين يجدونه مكتوباً عندهم فی التورة والانجيل﴾ (الاعراف:۱۵۷) محمد رسول اللہ انبیائے سابقین کی جس وراثت کے امین ہیں اور جس مشن کو خوشگوار انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری آپ پر عائد کی گئی اس سے فطری طور پر یہ بات مترشح ہوتی تھی کہ آخری نبی کسی خاص نسل، گروہ یا جغرافیائی سرحدوں میں رہنے والے انسانوں کے لئے مبعوث نہیں ہوا

ہے بلکہ اس کے پیش نظر عام انسانیت کی فلاح ہے۔ کسی ایسے بین الاقوامی نبی سے، جس پر آنے والی پوری تاریخ کا انحصار ہو، یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی کوئی الگ امت بنائے گا اور صرف اس کی فلاح ونجات کو اپنا ہدف قرار دے لے گا۔ دین ابراہیمی کے سچے وارث کی حیثیت سے محمدؐ رسول اللہ بھلا ایسا کیسے کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم تاریخ کے ابتدائی ایام میں کسی گوشہ سے امت محمدیہ کی اصطلاح سننے میں نہیں ملتی۔ محمدؐ ہی پر کیا موقوف دنیا کے کسی نبی نے بھی اپنی ذات کی بنیاد پر کسی امت کی تشکیل کی کوشش نہیں کی۔ یہودی، نصرانی، بدھشٹ جیسی شناختیں بہت بعد کی پیداوار ہیں جو اپنے داعیوں کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد ان کے متبعین نے ایجاد کر ڈالیں۔ نبی کا یہ مقام نہیں کہ وہ وحدت آدمیت کو ٹکڑوں میں بانٹے یا خدا کی طرف بلانے کے بجائے اپنی شخصیت پرستی کی دعوت دے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص کو خدا کتاب وحکمت اور نبوت سے سرفراز کرے وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ لوگو میری شخصیت پرستی میں متبلا ہوجاؤ کونوا عبادی (۳:۷۹) تمام انبیاء کی طرح محمد رسول اللہ کی دعوت بھی ﴿کونوا ربّنیین﴾ سے عبارت ہے۔ ایک ایسی دعوت جس پر ابراہیم واسمٰعیل، اسحٰق ویعقوب، ان کی نسلیں، موسیٰؑ وعیسیٰؑ اور دیگر تمام انبیاء شہادت دیتے رہے ہیں۔ جو لوگ محمد پر ایمان لائے ان کے لئے تکمیل ایمان کی شرط کے طور پر یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ان انبیاء میں کوئی فرق نہیں کرتے ﴿لانفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون﴾ (آل عمران: ۸٤)۔

﴿کونوا ربّنیین﴾ کی دعوت جب اپنے محور سے ہٹ جاتی ہے اور دین داری کے نام پر گروہی عصبیت یا انبیاء اور ان کے سرکردہ متبعین کی شخصیت پرستی جزو دین قرار پاتی ہے تو دراصل اس Process کا آغاز ہوجاتا ہے جسے ہم دین کے حوالے سے دین کی نفی کا نام دیتے ہیں۔ یا جسے عرف عام میں مذہب، مسلک یا رسومِ عبودیت کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر دین رویۂ سپردگی کے بجائے شناخت قرار پاتا ہے۔ امتیں اپنے انبیاء کی شاندار تاریخ اور اس سے اپنے تعلق کو وجہ نجات قرار دے لیتی ہیں۔ اہل یہود ونصاریٰ کی ان خوش گمانیوں کا قرآن میں بکثرت بیان ملتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کا یہودی یا عیسائی ہونا ان کی نجات کیلئے کافی ہے۔ قرآن نے شناخت یا نسبت کی بنیاد پر نجات کے خیال کو مسترد کر دیا اور یہ بات واضح کر دی کہ ﴿قل یاھل الکتاب لستم علی شئی حتی تقیموا التوراۃ والانجیل﴾ (المائدۃ:٦٨)۔ رہی یہ بات کہ ربانیوں کا یہ گروہ جو نئے نبی کی قیادت میں نجات کا طالب ہے اپنے لئے جو بھی شناخت اختیار کرے تو جس طرح وقت کے مسلمانوں (اہل یہود ونصاریٰ) کی انبیائی نسبتیں ان کی نجات کیلئے کافی نہیں ہوسکتیں اور یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا کہ ابراہیم واسمٰعیل اور اسحٰق ویعقوب یہودی یا نصاریٰ تھے۔ اسی طرح کوئی یہ نہ سمجھے کہ محمدؐ کوئی نئی شناخت یا نیا گروہ بنانے آئے ہیں یا ایسی کوئی شناخت ان کے متبعین کے لئے وجہ نجات ہوسکتی ہے۔ شناخت کی بنیاد پر نجات کے اس جھگڑے کا فیصلہ یوں کر دیا گیا کہ خدا کے نزدیک اہمیت عمل کی

ہے ﴿ولنآ اعما لنا ولکم اعمالکم و نحن له مخلصون﴾ (البقرۃ:۱۳۹)۔ان تمام غیر معتبر شناخت کے مقابلے میں نئے نبی کی قیادت میں ربانیوں کا جو گروہ تشکیل پایا ہے اس سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ گروہ بندی اور فرقہ پرستی سے اوپر اٹھ کر اپنے لئے ایک خدائی شناخت کو منتخب کرے ﴿صبغة الله ومن احسن من الله صبغة﴾ (البقرۃ:۱۳۸)۔یہودی یا عیسائی شناختوں کے مقابلے میں اگر ایک نئی محمدی شناخت وجود میں آجاتی تو یہ سب کچھ ایک عالمی ربانی پیغمبر کے شایان شان نہ ہوتا جو بیک وقت تمام پچھلے انبیاء، ان کی کتابوں پر ایمان کو لازم قرار دیتا ہو اور جو سابقین اور ان کی باقیات کو اپنا فطری حلیف گردانتا ہو۔

ربّانی بنام محمدی

متبعین محمد کی ابتدائی نسلیں جب تک ربانی شناخت سے متصف رہیں ان کے فکر و نظر پر یہ خیال غالب رہا کہ وہ دینِ ابراہیمی کی نقیب اور تمام انبیائے سابقہ کی وراثتوں کی امین ہیں۔ان کی پیش قدمی مانند سیل رواں جاری رہی۔گم گشتہ انسانیت کے قافلے، انبیائے سابقین کے باقیات جوق در جوق آخری نبی کی ربانی تحریک میں شامل ہوتے رہے۔عام انسانوں کو ایسا لگتا تھا جیسے اس ربانی تحریک کے دروازے ان پر وا ہیں۔یہ تحریک کسی مخصوص گروہ یا قوم کی سبقت یا بالا دستی کی دعوت نہیں دیتی بلکہ اس کی وسعت میں پوری دنیائے انسانیت کی نجات کا سامان موجود ہے۔خدائے واحد کی غیر مشروط بندگی کی یہ دعوت دنیائے انسانیت کو ایک دھاگے میں پروتی اور اسے ایک رشتۂ اخوت میں متحد کرتی۔اطاعت گزاروں کا یہ قافلہ جس میں تمام ہی انبیاء اور ان کے سچے متبعین شامل بتائے جاتے تھے وحدت انسانیت کی ایک ایسی آفاقی دعوت تھی جس سے ہر ذی شعور شخص خود کو منسلک محسوس کرتا۔

تمام گروہی شناخت کی نفی اور ربانی شناخت پر اصرار کا ہی نتیجہ تھا کہ متبعین محمد کی پہلی نسل بادیہ نشین عربوں کے بے سرو سامان قافلے جب مختلف سمتوں میں اس صدائے انقلاب کو لے کر نکلے تو عرب و عجم، شمال و جنوب ہر جگہ ان کا والہانہ استقبال ہوا۔عام انسانوں نے ان بادیہ نشینوں کو اپنا نجات دہندہ تصور کیا۔انہیں اس کا خیال بھی نہ آیا کہ ربانی دعوت کے ان علمبرداروں کا تعلق کسی اجنبی تہذیب سے ہے، ان کی زبان مختلف اور ان کا طرزِ زندگی عرب ثقافت کا امین ہے کہ داعی اور مدعو دونوں کے لئے زبان و ثقافت، رنگ و نسل کا امتیاز، جغرافیائی سرحدیں اپنی معنویت کھو چکی تھیں۔تب ربانی تحریک میں ہر شخص خواہ وہ عرب ہو یا عجم اپنی شرکت کے یکساں مواقع دیکھتا تھا اور اپنی نجات کے لئے یکساں امکانات پاتا تھا۔مشترکہ پیغمبرانہ وراثت کے یہ امین جو عالمی سطح پر ایک ربانی معاشرے کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے تھے، ابتدائی دنوں میں ربانی نظام زندگی کی ایسی نظیر قائم کی جس پر

نہ تو کسی خاص ثقافت کے غلبہ کا گمان ہوتا تھا اور نہ ہی کسی امپائر سازی کا شبہ کہ متبعین محمد کی پہلی نسل اپنے طرز عمل سے امپائر بلڈنگ کی نفی کرتی رہی۔

البتہ رفتہ رفتہ جب قرآن کا آفاقی پیغام اور وحدتِ انسانیت کی دعوت نگاہوں سے اوجھل ہوتی گئی، ربانی پیغام عرب ثقافت کے قالب میں دیکھا جانے لگا اور ہمارے علماء ودانشور اس خیال کے قائل ہوتے گئے کہ مسلم ثقافت دراصل قرآنی دائرہ فکر کا ہی فکری تسلسل ہے اور یہ کہ اسلام کے مفاد کو مروجہ مسلمانوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا، ہمارے یہاں ربانی طرزِ فکر کے زوال کا بگل بج گیا۔ عرب ثقافت فی نفسہٖ وجہ امتیاز قرار پائی اور غیر عربوں کو موالیوں کی شکل میں ربانی تحریک کی سرحد پر اکتفا کرنا پڑا۔ جب ایک بار ربانی دعوت کے بجائے خاندانی عزّ وشرف، نسلی تفاخر اور عرب عصبیت جیسے عوامل کو اہمیت مل گئی تو پھر ربانیوں کے اس گروہ سے صبغۃ اللہ کا وہ مجموعی تاثر زائل ہوتا گیا۔ دیگر اقوام کے مقابلے میں مسلم قومی عصبیت ایک معتبر شناخت کی حیثیت سے سامنے آئی۔ خانوادۂ نبوت کے دوسرے گروہ اور سعید نفوس کے دیگر قافلے خود کو اس نئی مسلم تحریک سے الگ محسوس کرنے لگے۔ جن لوگوں نے محمد رسول اللہ کی بعثت کے بعد بھی اپنی یہودی، عیسائی جیسی شناختوں کو باقی رکھا تھا ان کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی تو عیاں تھی البتہ اب نئی مسلم قومی عصبیت کے سامنے آجانے سے خود ربانیوں کا یہ گروہ بھی فرقۂ محمدی کی نفسیات سے دوچار ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بین الاقوامی رسول کو جو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے ایک مسلم قومی نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ پھر بہت جلد توحید کے ان علمبرداروں میں بھی اقوام سابقہ کی طرح، اپنے نبی کے حوالے سے گروہی شناخت کے داعیے نے سر اٹھایا۔ توحید کی علمبردار امت جو کبھی خدائے واحد کی بنیاد پر وحدت انسانیت کی علمبردار تھی اور جس کے دل ودماغ اس احساس سے معطر رہتے کہ وہ تمام انبیاء ورسل کی دعوتوں کا ارتکاز ہیں۔ بدقسمتی سے وہی لوگ خود کو امت محمدی کا علمبردار سمجھنے لگے۔ اس تنگ نظری نے انہیں صرف منصبِ نبوت سے ہی معزول نہیں کیا بلکہ آخرت کے سلسلے میں بھی بے شمار خوش گمانیوں اور امانیات نے ان کے عقیدے میں مستقل اپنی جگہ بنالی۔

بھلا قرآن مجید سے بڑھ کر اور کون سا مستند وثیقہ ہوسکتا ہے جو محمد رسول اللہ کی غایتِ بعثت کی تشریح وتعبیر کرسکتا ہو۔ دفتین کی اس کتاب میں، جو آج تک پوری صحت کے ساتھ امت کو منتقل ہوتی رہی ہے، امت محمدیہ جیسی کوئی اصطلاح نہیں پائی جاتی۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں رسول اللہ کو ایک ایسے نبی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جو دینِ ابراہیمی کے احیاء کے لئے بھیجا گیا ہو اور جو اہلِ کتاب کے دیگر گروہوں کے مقابلے میں دینِ ابراہیمی کا سب سے مستند پیروکار ہے۔

امت محمدی کا نوتراشیدہ تصور اس بات سے عبارت تھا کہ اب تاریخ کے آخری لمحے تک صبغۃ اللہ کے حاملین کے بجائے ایک ایسی قوم اپنے غلبہ اور سیادت کی تیاری کررہی ہے جو محمد رسول اللہ کی باقیات میں سے ہے۔ ظاہر ہے دوسری اقوام کے لئے

امت محمدی کے سیاسی غلبہ یا اس کی عالمی قیادت میں کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر آنے والے دنوں میں اس قومی شناخت کی بنیاد پر اموی اور عباسی سلطنتوں کے جاہ وحشم، اسپین اور دہلی میں امت محمدیہ کے سیاسی عروج اور عثمانی ترکوں کی قیادت میں ملک گیری کی توسیع کا جو منظر سامنے آیا اس سے بھی یہی کچھ مترشح ہوتا تھا کہ امتِ محمدیہ دوسری اقوام پر اپنے سیاسی، عسکری اور تہذیبی تفوق کیلئے کوشاں ہے۔ بظاہر مسلم ریاستوں کی سرحدیں وسیع ہوتی رہیں، عرب مسلم تہذیب وثقافت کے مرکز میں علم وفن کے چراغ کی لو مسلسل تیز ہوتی رہی، مگر فی الواقع نظری اعتبار سے متبعینِ محمد کی یہ نسلیں مسلسل زوالِ فکر ونظر سے دوچار تھیں، جہاں منصب کارِ رسالت سے منہ موڑ کر اب ان کے ارباب حل وعقد اپنی کھال میں مست تھے۔ گروہی اندازِ فکر نے خود بین المسلمین خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جو لوگ کبھی وحدتِ انسانیت کے علمبردار تھے اب وہی لوگ آپس میں شیعہ سنی، حنفی شافعی شناختوں کے حوالے سے خونریز تصادم میں مبتلا ہو گئے۔ اس صورتِ حال نے اموی سلطنت کی بساط لپیٹ دی، عباسی سلطنت کا چراغ گل کر دیا۔ نظری اعتبار سے امت اتنے مختلف گروہوں میں بٹ گئی کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا کہ حق پر کون ہے اور کسے واقعی محمد رسول اللہ کا سچا امین کہا جا سکتا ہے۔ اہل فکر ونظر مسلسل اس خیال کا اظہار تو کرتے رہے کہ ہمارے تاریخی سفر میں کہیں کوئی بنیادی گڑبڑی ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے ہر اگلا قدم ہمیں اپنی منزل سے مزید دور کر دیتا ہے۔ مگر اصلاحِ احوال کے لئے جتنی بھی کوششیں ہوئیں ان کا لب لباب یہی تھا کہ امتِ محمدی کو کسی طرح غلبہ وتفوق عطا کر دیا جائے۔ اس خیال کی طرف توجہ کم ہی گئی کہ ربانی امت کا جو تصور ہمارے دل ودماغ سے محو ہو چکا ہے اور جس کی وجہ سے ہم گروہی انداز سے سوچنے اور محدود گروہی نتائج پیدا کرنے پر مجبور ہیں، اس آفاقی نقطۂ نظر کی ازسرِ نو تشکیل کا کام کیسے انجام دیا جائے۔

امت مسلمہ کے وسیع آفاقی تصور سے دست کشی اور امتِ محمدی کے نئے نظری خول کی تعبیر نفسیاتی اور فکری ہر دو سطح پر پسپائی سے عبارت تھی، جس نے بہت جلد متبعینِ محمد کی اگلی نسلوں کو منصبِ سیادت سے معزول ومعطل کر کے رکھ دیا۔ جب تک مسلمانوں کی موجودہ نسل کو کارِ نبوت کے اعلیٰ منصب کا پھر سے ادراک نہیں ہوتا اور ان کے دل ودماغ اس خیالِ تقلیب انگیز سے مامور نہیں ہوتے کہ وہ رحمۃ للعالمین کے امین، تمام انبیائی تحریکوں کے نکتہ ارتکاز اور تاریخ کے آخری لمحے تک انسانیت کی عمومی فلاح ونجات کی خاطر معبوث کئے گئے ہیں تب تک وہ امت محمدی کے نفسیاتی گنبد میں خود کو مقید رکھنے پر مجبور پائیں گے۔

امت مسلمہ بنام امت محمدیہ

امت مسلمہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، جس کی تشریح وتعبیر اس دعائے براہیمی سے ہوتی ہے ﴿ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتناامة مسلمةلك و أرنا مناسكنا و تب علينا انك انت التواب الرحيم﴾ (البقرۃ:۱۲۸) اس دعا کی

مزید تفسیر کرتے ہوئے اگلی آیتوں میں مزید ارشاد ہے کہ جو دین براہیمی سے بے رغبتی کرے گا وہ دراصل اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا ہے۔ وہی ابراہیم جس کی اطاعت پر خود قرآن نے گواہی دی کہ جب اس سے کہا گیا کہ اطاعت گزار بن تو بول اٹھا ﴿اسلمت لرب العالمین﴾۔ بات یہیں ختم نہیں ہوگئی بلکہ اطاعت گزاری کی یہ روایت انہوں نے آگے بڑھائی۔ ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی ﴿یبنیّ ان اللہ اصطفی لکم الدین فلاتموتن الاوانتم مسلمون﴾ (البقرۃ:۱۳۲) کہ تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم اطاعت گزاروں میں سے ہو۔ حضرت یعقوب جب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کے دل و دماغ پر بھی یہی فکر سوار تھی کہ میرے بعد ایسا نہ ہو کہ میرے بچوں کی اطاعت گزاری میں کوئی کمی واقع ہو جائے لہٰذا دنیا سے جاتے ہوئے انہوں نے اپنی اولاد سے اس بارے میں اطمینان حاصل کرنا مناسب جانا۔ بچوں کا یہ جواب ﴿نعبد الٰھك واله ابائك ابراهيم واسمعيل واسحق الها واحدا ونحن له مسلمون﴾ (البقرۃ:۱۳۳) اس دعائے براہیمی کا تسلسل ہے جس میں ابراہیم نے اپنی ذرّیات میں سے امت مسلمہ اٹھانے کی التجا کی تھی۔

قرآنی بیان کے مطابق امت مسلمہ دراصل خانوادۂ نبوت اور ان کے سچے متبعین پر مشتمل ایک ایسا گروہ ہے جس نے تاریخ کے ہر لمحے میں اور دنیا کے ہر خطے میں غیر مشروط اطاعت گزاری کی ریت کو برقرار رکھا ہے۔ اطاعت گزاروں کا یہ گروہ زمان و مکان، نسلی، لسانی اور جغرافیائی سرحدوں سے بے نیاز ہے۔ جس نے سچی اطاعت اختیار کی اللہ نے اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ اطاعت گزاروں کے اس قافلے میں شامل ہونے اور قرب الٰہی کی بشارت کا مستحق قرار پانے کیلئے کسی کا عورت یا مرد ہونا بھی اس راہ کی رکاوٹ نہ بن سکا، ﴿یامریم ان اللہ اصطفٰك وطهرك واصطفك على نسآء العٰلمين﴾ (آل عمران:۴۲) یا حضرت آسیہ کو آنے والی نسلوں کیلئے بطور نمونہ پیش کرنا اسی خیال کی تصدیق ہے کہ خدا کے نزدیک اطاعت گزاروں کے قافلے میں شمولیت کے لئے عمل کی ہی اہمیت ہے۔ دوسری تمام نسبتیں یا حوالے کچھ معنی نہیں رکھتے لہٰذا جو لوگ ﴿کونوا هوداً او نصارىٰ﴾ پر اصرار کرتے ہیں یا جو امت محمدیہ سے نسبت کو نجات کے لئے کافی سمجھے بیٹھے ہیں ان کے لئے یہ تنبیہ و تحذیر ہے ﴿قل بل ملة ابراهيم حنيفا﴾ کہ وہ بلا پس و پیش ابراہیمی طریقے کو اختیار کر لیں۔ امت مسلمہ سے الگ کسی نبی کو فرقہ بندی کی عینک سے دیکھنا یا اس پر یہودی، نصرانی یا محمدی شناخت کے علمبردار ہونے کا الزام عائد کرنا، ایک ایسی بے اصل بات ہے جس کی تنبیہ کرتے ہوئے قرآن انبیائے سابقین کے متبعین سے کہتا ہے ﴿ء انتم اعلم أم اللہ﴾ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ انبیاء پر اس طرح کی گروہ بندی کا الزام عائد کرنا دراصل بہت بڑا ظلم ہے حقیقت سے جان بوجھ کر چشم پوشی ہے۔ ﴿ومن اظلم ممن كتم شهادة عنده من الله وما الله بغافل عما تعملون﴾ (البقرۃ:۱۴۰)۔

یہ ہے امت مسلمہ کا وہ تصور جو قرآن کے صفحات سے برآمد ہوتا ہے۔ ابراہیم و اسمٰعیل، اسحٰق و یعقوب اور تمام انبیائے

سابقین اوران کے سچے متبعین کی ایک جگمگاتی کہکشاں۔جس طرح ﴿محمد رسول الله والذین معه﴾ (الفتح:۲۹) آنے والی تاریخ میں سیادت پر فائز کئے گئے ہیں اسی طرح ﴿ابراهیم و اسماعیل، اسحاق و یعقوب والاسباط﴾ (النساء:۱۶۳) پر مشتمل راہ یاب قدسی نفوس کے اس وسیع مجموعے کا نام امت مسلمہ ہے۔جولوگ پھر بھی اس بات پر اصرار کریں کہ امت مسلمہ سے مراد صرف امت محمدیہ یا اس سے نسلی تعلق رکھنے والے لوگ ہیں کیا وہ اس بات کی جسارت کر سکتے ہیں کہ براہیمی سلسلے کے دوسرے انبیاء کے متبعین یا آسیہ ومریم جیسی سپردہ نفوس کو امت مسلمہ کے اس وسیع دائرے سے باہر کردیں۔

صرف اطاعت گزاروں کے لئے اہل ایمان یا اہل اسلام کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ اہل کفر ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں سے توحید کا دامن جاتا رہا، گویا حبل اللہ سے ان کا تعلق ٹوٹ گیا۔یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی پراگندگئ فکر ونظر کی وجہ سے اب کسی عمل صالح کے لائق نہیں رہے۔دائرہ توحید سے ایک بار باہر آجانا فسادِ فکر ونظر کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کردیتا ہے۔انبیاء کی وارث قومیں بھی اگر شرک کے راستے پر چل نکلیں تو ان کا شمار اطاعت گزاروں میں نہیں ہوسکتا۔﴿لقد کفر الذین قالوا ان الله هو المسیح ابن مریم﴾(المائدة:۱۷) یا ﴿لقد کفر الذین قالوا ان الله ثالث ثلثة﴾ (المائدة:۷۳) جیسی آیتیں اس بات پر دال ہیں کہ خود کو اہل ایمان کہلانے والے لوگ بھی اگر توحید سے دست کش ہوجائیں تو ان کے اس صریح کفر کو خوشنما اصطلاحات یا فقہی معاریض میں نہیں چھپایا جاسکتا اور نہ ہی ان کا یہ کہنا ان کی نجات کی ضمانت بن سکتا ہے کہ ﴿نحن ابنٰاء الله واحبآؤه﴾ (المائدة:۱۸)۔اس کے برعکس جن لوگوں نے توحید کا دامن تھام لیا اور عمل صالح میں لگے رہے تو ان کیلئے کسی رنج و غم کی ضرورت نہیں۔

سورہ انبیاء میں انبیائے سابقین کے تذکرے اوران کی اطاعت گزاری کے بیان کے بعد صریح الفاظ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ﴿ان هذه امتکم امة واحدة﴾ (المؤمنون:۵۲) اطاعت گزاروں کا یہ طویل سلسلہ جس میں ابراہیم سے لیکر لوط وسلیمان، ایوب واسمٰعیل، ادریس وذوالکفل، ذوالنون وزکریا، یحیٰ اور مریم جیسے پاکیزہ نفوس شامل ہیں، دراصل یہ ایک ہی امت ہے۔یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے آپس میں گروہ بندی کرلی ﴿فتقطّعوا امرهم بینهم﴾ (المؤمنون:۵۳) البتہ ان سبھوں کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے سو ان میں سے جو کوئی نیک عمل کرے گا اور وہ اہل ایمان میں سے ہوگا، تو اس صریح وضاحت کے بعد اس بات کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ اہل توحید پر مشتمل اس ایک امت سے انبیائے سابقین کے سچے متبعین کو خارج کردیا جائے ﴿کان الناس امة واحدة﴾ (البقرة:۲۱۳)، ﴿ان هذه امتکم امة واحدة﴾ کے تناظر میں ﴿ان ابراهیم کان امة قانتا﴾ (النحل:۱۲۰) کے قرآنی بیان کو ملاحظہ کیجئے۔وہی ابراہیم جو اہل توحید کے قافلے میں ایک خاص فضیلت کے حامل ہیں جن کی غیر مشروط اور بے مثال اطاعت گزاری پر خود قرآن گواہ ہے۔اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنے اندر ابراہیم جیسے ایمان

کی شان پیدا کریں۔ جو تمام جھوٹی شناختوں سے ماوراء رب کائنات کی عبودیت کا سچا رنگ لئے ہوئے ہے۔ دین ابراہیمی کے حاملین اور انبیاء سابقین کے تمام متبعین اسی راستے پر گامزن ہیں جس کی دعوت محمد رسول اللہ دے رہے ہیں۔ جن کے تذکرے سے توراۃ وانجیل کے صفحات پُر ہیں۔ ﴿الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل﴾ (الاعراف:۱۵۷)۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اطاعت گزاروں کے اس قافلے میں مختلف چھوٹی چھوٹی امتیں پیدا ہوجائیں، خدا کے یہ برگزیدہ بندے جھوٹی گروہی شناخت میں مبتلا ہوجائیں کہ ایسا کرنا شرک کا دروازہ کو کھولنا ہے۔

امت مسلمہ کا یہی وہ ہمہ گیر تصور ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں انبیائے سابقین کی باقیات کے لئے ہمیشہ خیر سگالی کے جذبات کو برقرار رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ان ایّام میں بھی جب اصحابِ رسول کو اہل کتاب کے بعض گروہوں کی سخت مخالفت کا سامنا تھا، ان جنگی حالات میں جب نزول قرآن کے وقت اہل یہود کے بعض گروہ مسلسل ریشہ دوانیوں میں مبتلا تھے، قرآن نے اہل کتاب کے ان سعید نفوس کی ستائش سے اجتناب نہیں کیا جو خود اپنے ہم قوموں کے برعکس خدا ترسی کی راہ پر گامزن رہے ﴿لیسوا سواءً من اھل الکتٰب امۃ قائمۃ یتلون آیات اللہ﴾ (آل عمران:۱۱۳) یا ﴿ومن قوم موسیٰ امۃ یھدون بالحق﴾ (المائدۃ:۱۵۹) جیسی آیات اسی بات کو ذہن نشین کراتی ہیں کہ انسانوں کو محض کسی قومی شناخت کی بنیاد پر اہل کفر یا اہل ایمان کی گروہوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ جو خدا ﴿ان اکرمکم عنداللہ اتقکم﴾ کی بشارت دیتا ہو اور جس کا وعدہ ہو کہ ﴿لاتزروازرۃ وزراخریٰ﴾ وہ بھلا یہ کیسے پسند کرسکتا ہے کہ کسی شخص کی نسلی یا گروہی شناخت اس کے عمل صالح کو ساقط الاعتبار قرار دینے کا سبب بن جائے۔ اہل ایمان خواہ وہ کسی بھی تہذیب میں پائے جاتے ہوں ان کے لئے تو قرآن میں واضح بشارت موجود ہے ﴿ان الذین اٰمنو والذین ھادوا والنصٰریٰ والصابئین من اٰمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون﴾ (البقرۃ:۶۲)۔

قرآن کی یہ آیت جس میں فلاح وکامرانی کی بشارت کا دائرہ امم سابقہ کے خدا ترسوں تک وسیع کردیا گیا ہے، بعض اصحابِ علم ودانش کے لئے سخت ذہنی خلجان کا باعث بنتی رہی ہے۔ ہمارے خیال میں اس خلجان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان محمد رسول اللہ کی دعوت کو تمام انبیائے سابقین کے ارتکاز کے طور پر دیکھنے کا رواج کم ہی رہا ہے۔ حالانکہ قرآن با سالیب مختلف اس مجموعی تاثر کو بار بار ذہن نشین کراتا ہے کہ محمدؐ دین ابراہیمی کے داعی ہیں جنہیں امت مسلمہ کے احیاء اور تاریخ کے آخری لمحے تک اس کی قیادت پر مامور کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام جو تمام انبیاء کے ذریعے بلند کیا گیا کلمہ حق ہے، اس کا محور ومرکز خدائے واحد کی پرستش ہے یہ ایک God-centered دین ہے، جہاں انبیاء علیہ السلام کی جگمگاتی کہکشاں میں کسی نبی کو کسی نبی پر فوقیت نہیں دی جاتی۔ خدا کے سچے پرستار سبھوں پر بیک وقت ایمان لاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اسلام کو

محمد الاصل Mohammad-centered دین کی حیثیت سے دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو دراصل ان کے ذہنوں پر St. Augustine جیسے عیسائی راہبوں کے عقائد کا سایہ ہے جنہوں نے اپنی تبلیغی اور فکری کاوشوں سے حضرت مسیح کو نجات کے لئے بنیادی پتھر باور کرا رکھا ہے اور اس طرح عیسائی تصور کائنات میں نجات صرف فرقہ عیسوی کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید نجات جیسے مسئلہ کو سرے سے انسانی بحث وتمحیص کے دائرے سے باہر قرار دیتا ہے۔ روزِ آخر کون جنت میں جائے گا اور کسے واصل جہنم کیا جائیگا، یہ وہ حساس امور ہیں جن پر کوئی قولِ فیصل انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اہل کتاب کو تو چھوڑیے، انہیں تو قرآن دینِ محمدی کے فطری حلیف کے طور پر پیش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے دامن شرک سے آلودہ ہو گئے ان کیلئے بھی خدا کا ارشاد ہے کہ سزا و جزا کا یہ فیصلہ وہ بذاتِ خود روزِ حشر انجام دے گا۔ اس بارے میں کوئی گفتگو انسانوں کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے: ﴿ان الله يفصل بينهم يو م القيامة﴾ (الحج:۱۷)۔

جس طرح مختلف شعوب وقبائل سے انسانوں کا تعلق محض تعارف کیلئے ہے ﴿وجعلناكم شعوبًا وقبائل لتعارفوا﴾ (الحجرات:۱۳) اسی طرح یہ بھی خدائی اسکیم کا ایک حصہ ہے کہ اس کے سچے بندے مختلف دینی شناخت کے ساتھ جانے جائیں: ﴿ولو شاء الله لجعلهم امة واحدة﴾ (الشوریٰ:۸) اگر خدا ترسوں کے مختلف گروہ انبیائے سابقین کی باقیات وذرّیات، خود کو راہ یابی کے مختلف سلسلوں سے وابستہ پاتے ہوں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ توراۃ وانجیل بھی اسی خدا کی کتاب ہے اور وہاں بھی ہدایت اور روشنی موجود ہے۔ انبیائی پیغام سے اپنا تعلق بتانے والوں کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی نجات کا فیصلہ کرنے کیلئے بیٹھ جائیں یا اس خیال کی وکالت کرنے لگیں کہ لوگو! یہودی اور عیسائی ہو جاؤ نجات اسی میں ہے اور جو اس شناخت سے باہر رہ گیا اس کیلئے نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ اس کے برعکس قرآن کا مطالبہ ہے کہ انبیائی ہدایت کے امین، مختلف تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں، غیر ضروری مباحثے میں اپنی قوتوں کو ضائع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کریں کہ وہ ایک دوسرے پر نیکی کے کاموں میں سبقت لے جائیں۔ خدا کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ تمام انسانوں کو یا اہل حق کے تمام ہی گروہوں کو ایک امت بنا دیتا لیکن اس کی تو اسکیم یہ ہے کہ جس امت کو جود یا گیا ہے اسی کی بنیاد پر اسے آزمائے: ﴿ولكن ليبلوكم فى ما آتاكم فاستبقوا الخيرٰت﴾ (المائدۃ:۴۸)۔

مسلمانوں کی پہلی نسل جو انبیائی سلسلے میں محمد رسول اللہ کے مقام عظمت سے واقف تھی اس نے ان امور کو کبھی معرض بحث نہیں بنایا کہ روز محشر انبیائے سابقین کے متبعین کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہل کتاب کے حوالے سے وہ اس دعوت کے امین رہے کہ اے اہل کتاب آؤ ان بنیادی باتوں کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترکہ ہیں: ﴿قل يٰا اهل الكتٰب تعالوا الىٰ كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا و لا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانامسلمون﴾ (آل عمران:۶۴)۔

جولوگ انسانیت کی سیادت پر فائز کئے گئے ہوں ان کے مقام بلند کا یہ فطری تقاضہ تھا کہ وہ اہل حق کے تمام ہی گروہ کو وسعتِ قلبی کے ساتھ قبول کریں۔تمام اہل حق پر نئی نبوی تحریک میں شرکت کا دروازہ کھلا رکھیں تبھی یہ ممکن ہے کہ انبیائے سابقین کے سچے اور جھوٹے دعویدار الگ ہوسکیں۔جولوگ واقعی خداشناس ہوں گے وہ" فاستبقو الخیرا ت " کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔ربانی تحریک کی راہ میں ایسے خداشناس لوگ مزاحم نہیں ہوسکتے۔رہے وہ لوگ جنہوں نے یہودی یا نصرانی نسبتوں کو ہی وجہ نجات سمجھ رکھا ہے تو ان کیلئے صاف صاف بتادیا گیا کہ ﴿قل یا ھل الکتٰب لستم علی شئی حتیٰ تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم﴾ (المائدۃ:٦٨) یہ نام نہاد اہل کتاب جو دین کے نام پر گروہی عصبیت جیسی لعنت میں مبتلا ہیں اور جن کا فرقہ ہی ان کے لئے الہٰ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تو شرک کے مارے ان نام ونہاد وارثینِ انبیاء سے تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔ایسا نہ ہو کہ گروہی عصبیت کا یہ زہر اور ان کی تنگ رجعت پسندانہ ذہنیت تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔سو اہل ایمان کو تلقین ہے کہ ﴿یایھاالذین اٰمنو لا تتخذ وا الیھود والنصٰریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض﴾ (المائدۃ:٥١)۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ اس قسم کے قرآنی بیانات اہل کتاب کی طرف کسی عمومی بیان کے مظہر ہیں کہ قرآن میں جابجا باقیات انبیائے سابقین کو نہ صرف یہ کہ شرکتِ عمل کی دعوت دی گئی ہے بلکہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے ممکنہ شبہات کا بھی ازالہ کردیا گیا ہے ﴿لیسوا سواءً من اھل الکتٰب امۃ قائمۃ یتلون اٰیٰت اللہ اٰناء الیل وھم یسجدون﴾ (آل عمران:١١٣)۔

یہ بات کہ اہل کتاب مسلمانوں کے فطری حلیف ہیں ابتدائی عہد میں ایک امر مسلمہ کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی تھی ۔قرآن نے اہل کتاب سے موالات کی راہ کھلی رکھی تھی۔ان کا کھانا پینا مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیا گیا تھا حتیٰ کہ معاشرتی تعلقات کے قیام کیلئے بھی صریح قرآنی ہدایات موجود تھیں۔عفت مآبی کی شرط کے ساتھ اہل کتاب کی عورتیں بھی عفت مآب مسلمان عورتوں کی طرح حلال قرار دی گئی تھیں ﴿الیوم احل لکم الطیبٰت وطعام الذین اوتوا الکتٰب حلّ لکم وطعامکم حلّ لھم والمحصنٰت من المومنٰت والمحصنٰت من الذین اوتوالکتٰب من قبلکم﴾ (المائدۃ:٥)۔ایک ایسے ماحول میں جہاں تقویٰ اور پاکیزگی کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تنظیم نو کی جارہی ہو، جہاں گروہی نسبتیں، نسلی تفاخر اور جھوٹی دینی شناخت کا لعدم قرار دی جارہی ہو، یہودی، عیسائی یا قومی مسلمان بنانے کے بجائے ربّانی بنانے کا غلغلہ بلند ہو، کسی کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ آنے والے دنوں میں متبعین محمد کا ذہنی افق اس قدر تنگ ہوجائے گا کہ ان کی نسلیں اپنے لئے ایک قومی شناخت کو گوارہ کرلیں گی اور مسلم ہونا ان کے درمیان رویّے کے بجائے شناخت بن کر رہ جائے گا۔ بدقسمتی سے بعض سیاسی حوادث اور تاریخی عوامل نے آنے والے دنوں میں ایک ایسے ہی تنگ نظر متعصب قومی شناخت کی راہ ہموار

کردی جس کے لئے جلد ہی روایات وتاریخ کے ماخذ اور فضائل سے متعلق تراشیدہ قصوں نے ایک مستقل نظامِ فکر مرتب کرڈالا۔ امت مسلمہ جو خود کو تاریخ کے آخری لمحے تک قیادت کے منصب پر فائز سمجھتی تھی اور جو امم سابقہ کی باقیات کو اسی قائدانہ وسعتِ نظری سے دیکھتی تھی رفتہ رفتہ انہیں رقیب تصور کرنے لگی۔ امت محمدیہ کی نفسیات کے جنم لینے سے نہ صرف یہ کہ قائدانہ نفسیات اور وسعتِ نظری کا خاتمہ ہوگیا بلکہ مسلمانوں کے ذہنوں پر یہ بات نقش ہونے لگی کہ وہ بھی دوسری امتوں کی طرح ایک امت ہیں ۔یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح قومی مسلمانوں نے بھی اپنی امت کو دوسری امت سے افضل باور کرانے کی خاطر خوش گمانیوں پر مشتمل روایات کی بھرمار کرڈالی۔حتیٰ کہ ایسی روایتیں بھی وجود میں آگئیں جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ روزِ قیامت کس طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان بآسانی داخل جنت کئے جائیں گے۔ایسا اس لئے کہ بعض روایتیں محمد رسول اللہ کو شفاعت کے اس منصب پر فائز کرتی تھیں جس کا یارا ابراہیم اور دوسرے انبیاء کو نہ تھا۔بعض روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ اس دن لواء الحمد صرف محمدؐ کے ہاتھ میں ہوگا جو اپنی امت کی خاطر خصوصی شفاعت کے لئے سارا زور صرف کردیں گے۔جیسا کہ بعض روایتیں بتاتی ہیں ایسا محسوس ہوگا کہ گویا عام مسلمانوں کے ساتھ بھی انبیائے بنی اسرائیل جیسا معاملہ کیا جارہا ہے۔

امت مسلمہ کے منصبِ عظیم سے بہت نیچے لاکر امت محمدی کی قومی عصبیت کو فروغ دینے کے لئے جو روایتیں وضع کی گئیں اس میں اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا گیا کہ اس کی زد رسول اللہ کے منصبِ عظیم پر کس طرح پڑتی ہے۔جو نبی تمام انسانیت کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا گیا اور جس کے رحمۃ للعالمین ہونے پر خود قرآن شاہد ہے اور جس کے بغیر آنے والی ساری انسانی تاریخ بے معنیٰ ہے،اس نبی کے بارے میں مسلمانوں میں یہ تصور عام ہوا کہ وہ دنیا سے بھی امتی امتی کرتا رخصت ہوا اور روزِ حشر بھی اپنی امت کو باریاب کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگادے گا۔جب رسول ﷺ کے بارے میں یہ خیال عام ہو کہ وہ عام انسانیت کے بجائے صرف اپنی امت کی فلاح وبہبودی کو مطلوب ومقصود جانتا ہو تو بھلا اس کے متبعین کے لئے یہ کیسے ممکن ہوتا کہ وہ اپنے تراشیدہ خولِ مسلمانی سے باہر آکر عام انسانیت کی نجات کی فکر اور اسے ہانکے پکارے فلاح وکامرانی کی طرف بلا سکے۔نتیجہ یہ ہوا کہ سیادت پر فائز امت اپنی پیدا کردہ امانیات اور خوش گمانیوں کے زیر اثر خود ساختہ معزولی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی۔

متبعین محمدؐ کی ابتدائی نسلیں جب تک ربانی شناخت سے متصف رہیں ان کے فکر ونظر پر یہ خیال غالب رہا کہ وہ دینِ براہیمی کی نقیب اور تمام انبیائے سابقہ کی وراثتوں کی امین ہیں۔ ان کی پیش قدمی مانند سیل رواں جاری رہی۔ گم گشتہ انسانیت کے قافلے، انبیائے سابقین کے باقیات جوق در جوق آخری نبی کی ربانی تحریک میں شامل ہوتے رہے۔ عام انسانوں کو ایسا لگتا تھا جیسے اس ربانی تحریک کے دروازے ان پر وا ہیں۔